R. No. 2106/57 Regd. No. L. 922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

تاریخ اشاعت
۱-۸-۱۵-۲۲

ٹیلی فون — ۲۹
قیمت پانچ روپے سالانہ
فی پرچہ دس نئے پیسے

۱۵ اپریل ۱۹۶۵ء | ایڈیٹر: آل احمد سرور | جلد ۲۴ - شمارہ ۱۵

اداریہ

ادیبوں کی اپیل

ہم نے ادیبوں کی جو اپیل دستخطوں کے لیے بھیجی ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ شاعروں، ادیبوں اور مصنفوں کے اردو زبان و ادب کی ترقی کے متعلق خیالات سارے ملک کو اور حکومت کو معلوم ہو جائیں۔ کچھ حلقوں میں یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ خالی خولی اس اپیل سے کیا فائدہ۔ یہ خیال صحیح نہیں۔ ہر سماج میں ادیبوں کا ایک خاص مقام ہے۔ ہمارے سماج میں بھی۔ اس لیے ادیبوں کی رائے کو کوئی سماج نظر انداز نہیں کر سکتا۔ یوں تو اردو کے ادیبوں نے زبان کے مسئلے پر اکثر اظہار خیال کیا ہے مگر یوں حکومت کو اب تک توجہ نہیں دلائی ہے۔ حکومت کو توجہ دلانے سے زبان کے سلسلے میں ہمارے مطالبے کی قدر و قیمت بڑھتی ہے۔ ادیبوں سے زیادہ زبان کے مسئلے پر اظہار خیال کا حق کسے ہے۔ وہ زبان کو نکھارتے اور سنوارتے ہیں۔ وہ اچھے ادب کے ذریعے سے اچھی قدروں کا احساس پیدا کرتے ہیں اور اس طرح سماج کو آگے بڑھاتے ہیں۔ ہمارے یہاں یوں تو ادیبوں اور شاعروں کی بڑی عزت ہے مگر ان کی سماجی مسائل میں رائے کو اہمیت نہیں دی جاتی حالانکہ ان کی رائے بڑی اہم ہے۔ اگر ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے اردو کے ادیب، شاعر اور مصنف اپنی رائے ظاہر کرتے ہیں تو اس کا اثر ہماری رائے عامہ پر ضرور پڑے گا۔ ہو سکتا ہے کہ حکومت اس رائے کو آج وہ اہمیت نہ دے جس کی وہ مستحق ہے لیکن کل اسے ایسا کرنا ہوگا۔ کوئی حکومت ادیبوں کی رائے کو عرصہ دراز تک نظر انداز نہیں کر سکتی۔ ہمیں جو بھی کام کرنے چاہئیں انھیں خالص سیاسی نقطۂ نظر سے نہیں دیکھنا چاہیے۔ سیاسی نقطۂ نظر سے ادیبوں کے پاس کوئی طاقت نہ سہی مگر سماج میں ان کے پاس ایک طاقت ضرور ہے۔ وہ عوام کو متاثر کر سکتے ہیں۔ اس طرح رائے عامہ کو بھی ہموار کر سکتے ہیں۔ اس اخلاقی کی طاقت کو حکومت کو بالآخر تسلیم کرنا پڑے گا۔ اس اپیل کے سلسلے میں بھی دستخط کی تعداد کو نہیں دیکھنا چاہیے بلکہ کوشش کرنا چاہیے کہ صرف انھیں لوگوں کے دستخط لیے جائیں جو شاعر، ادیب اور مصنف کی حیثیت سے عام طور پر مانے جاتے ہیں۔ مثلاً شاعر وہ لیے جائیں جن کا کلام رسالوں میں چھپتا ہے اور مشاعروں میں عام طور پر ان کی شرکت ضروری سمجھی جاتی ہے یا ان کا کوئی مجموعہ شائع ہوا ہے۔ ادیب وہ جنھوں نے ادب کے کسی پہلو کو اپنایا ہے اور اس سلسلے میں ایک امتیاز تک پہنچ چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ایسے بھی لکھنے والے ہیں جنھوں نے اگرچہ شاعری یا ادب پر توجہ نہیں کی ہے مگر معلومات عامہ کے سلسلے میں کتابیں لکھی ہیں یا تحقیق کی ہے یا عام طور پر ان کی علمی کاوشیں اردو میں ملتی ہیں۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہر ریاست کے ایسے علمی و ادبی کام کرنے والوں کی مجموعی رائے ملک کے سامنے آ جائے۔ ہمیں امید ہے کہ اس کام کو جلد سے جلد ریاستی کمیٹیاں بنا کر مکمل کر لیا جائے گا۔

اس شمارے میں

سیر بین

جب کسی کو کوئی چیز بری معلوم ہوتی ہے تو وہ اکثر اُسے صاف صاف بُرا نہیں کہتا، اس کا نام کچھ ایسا رکھ دیتا ہے کہ اس نام سے غیریت کی بو آئے۔ جب کبھی اردو کے کچھ مخالف اردو کے رسم خط کو عربی رسم خط یا فارسی رسم خط کہتے ہیں تو ہمیں یہ بات یاد آجاتی ہے۔ اردو کے موجودہ رسم خط کو فارسی یا عربی رسم خط کہنا کسی طرح درست نہیں۔ اس میں ہندی کے کئی حرف شامل ہوگئے ہیں اور کئی سو سال سے یہ اردو کی کتابوں کے لیے استعمال ہو رہا ہے آپ شوق سے اردو رسم خط کو بُرا کہیے مگر اس کے لیے اسے عربی یا فارسی رسم خط کیوں کہتے ہیں۔

یہ واقعہ ہے کہ رسم خط کا زبان سے کوئی بنیادی تعلق نہیں مگر جب کوئی رسم خط عرصۂ دراز تک کسی زبان کے لیے استعمال ہونے لگے تو اس کا ایک تاریخی اور ادبی تعلق ہو جاتا ہے۔ کوئی رسم خط مکمل اور جامع نہیں۔ ہر ایک میں کچھ خوبیاں ہیں اور کچھ خامیاں اردو رسم خط میں بھی خوبیاں اور خامیاں ہیں۔ خامیوں کی ہم اصلاح کر سکتے ہیں اور یہ اصلاح ضرور ہونی چاہیے، مگر اس کے یہ معنی کیسے ہو سکتے ہیں کہ ہم اپنا رسم خط بدل دیں۔

اردو زبان کو اس کے رسم خط کے ساتھ ہمیں باقی رکھنا ہے ورنہ اس کا سارا ادبی سرمایہ محفوظ نہ رہ سکے گا۔ نہ اس کی ساری آوازیں اپنے پورے حسن کے ساتھ آسکیں گی۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ جو لوگ اردو رسم خط سے واقف نہیں اور اسے سیکھنا نہیں چاہتے ان کے لیے دیوناگری یا رومن میں کتابیں نہ چھاپی جائیں۔ دیوناگری میں تو ہزاروں کی تعداد میں اب بھی چھپ رہی ہیں کیوں کہ ان کی مانگ ہے اس سلسلے کو جاری رہنا چاہیے۔ اسی طرح رومن رسم خط میں بھی اردو کی کچھ کتابیں چھپنی چاہئیں مگر اردو زبان کے رسم خط کو ہمیں باقی رکھنا چاہیے۔ علاوہ اس کے کہ یہ وقت اور جگہ کم لیتا ہے یہ بڑا خوبصورت خط ہے۔ ہاں اس کی اصلاح کو اب نہ ٹالنا چاہیے۔ ہم اس وقت سب سے بڑی ضرورت پر زور دینا چاہتے ہیں ہمارے نزدیک ب ج ع ل م جیسے حرفوں کی صرف دو شکلیں ہونی چاہئیں، ایک آدھی ایک پوری۔ پوری شکل صرف آخر میں آئے شروع یا درمیان میں صرف آدھی شکل آئے مثلاً ب کو لیجیے۔ بس، بحر، بد سب کو بس، بحر، بد لکھنا چاہیے اسی طرح ج ج، ع ع، ل ل، م م کی شکلیں اختیار کی جا سکتی ہیں۔

شاخ اعظم گڑھ

انجمن ترقی اردو (ہند) کی شاخ اعظم گڑھ کے عہدیداروں کا حسب ذیل انتخاب اتفاق رائے سے ۱۱ مارچ ۱۹۶۵ء کی نشست میں کیا گیا جس میں پچاس حضرات نے شرکت کی۔

صدر: جناب شاہ معین الدین ندوی، سکریٹری: عبدالحفیظ صدیقی، جوائنٹ سکریٹری: جناب ضیاء الرحمٰن اعظمی۔

اس نشست میں یہ بھی طے پایا کہ ۲۶ مارچ ۱۹۶۵ء کو ایک جلسۂ عام کیا جائے۔ ۲۶ مارچ کا جلسہ بر مکان جناب شبیر حسن صاحب زیر صدارت جناب بابو رام سنگھا زرائے پریسیڈنٹ میونسپل بورڈ و ڈسٹرکٹ کانگریس کمیٹی اعظم گڑھ منعقد ہوا۔ پروگرام حسب ذیل:

(۱) رپورٹ — عبدالحفیظ صدیقی (سکریٹری)

(۲) اردو زبان کا مسئلہ (مقالہ) — ڈاکٹر محمد عرفان ایم اے پی ایچ ڈی

(۳) ن۔ م۔ راشد (مقالہ) — فیض الرحمٰن اعظمی ایم۔اے

(۴) ادعا رلینے کا فن (مزاحیہ تحریر) — علی حماد عباسی ایم۔اے

(۵) فاصلہ (افسانہ) — ضیاء الرحمٰن اعظمی بی۔اے بی ایڈ

(۶) جمہوریت کے تقاضے (مقالہ) — محمد مجید زبیری ایم۔اے

مقالات کے بعد شعر و شاعری کے دور کا آغاز ہوا جس میں پروفیسر معراج احمد، پروفیسر احسن عشقی، جامی چریاکوٹی، احسان قریشی، پروفیسر چودھری معروف، ابرار اعظمی، حکیم تاجی، برق اعظمی، شمیم اعظمی، حنیف اعظمی، دانش چریاکوٹی، بسملی الاعظمی، وشنو پرشاد شیدا اور امین اشرف امین صاحبان نے غزلیں اور نظمیں سنائیں۔ آخر میں دان بہادر سنگھ سونڈا اور پروفیسر زبیری کے مزاحیہ کلام پر جلسہ کا اختتام ہوا۔ (عبدالحفیظ صدیقی)

بچوں کے ادب کا انعامی مقابلہ

مرکزی وزارت تعلیم نے بچوں کے ادب کے گیارھویں انعامی مقابلے کے لیے مصنفوں سے کتابیں مانگی ہیں۔ کتابیں بھیجنے کی آخری تاریخ ۳۰ر اپریل ہے۔

اس مقابلے کے لیے نصابی کتابوں کو چھوڑ ۱۹۶۲، ۱۹۶۳ میں وہ تمام شائع شدہ یا غیر شائع شدہ کتابیں بھیجی جا سکتی ہیں جنھیں مرکز یا ریاست سے کوئی انعام نہ ملا ہو۔

ہندی زبان میں لکھی ہوئی دو کتابوں کو اور آسامی، بنگالی، گجراتی، کنڑ، کشمیری، ملیالم، مراٹھی، اڑیا، پنجابی، سندھی، تامل اور اردو کی ایک ایک کتاب کو ایک ایک ہزار روپیہ کے پندرہ انعام دیے جائیں گے، نیز کتابوں کو خوبصورتی کے ساتھ مزین کرنے پر بھی ایک یا دو انعام دیے جائیں گے۔

(ٹائمز آف انڈیا)

ڈاکٹر محمود الٰہی

ہندی ادب کی پہلی تاریخ

اردو کے عالموں اور مصنفوں نے ہندی زبان و ادب کی ترویج و اشاعت میں جو دلچسپی لی ہے وہ اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ جوں جوں تلاش اور تحقیق کا دائرہ وسیع ہوتا جائے گا اور لسانی و ادبی مسائل پر تنقیدی نگاہ ڈالنے کا ذوق بڑھتا جائے گا، یہ حقیقت واضح تر ہوتی جائے گی کہ ہندی کے ساتھ اردو والوں کا برتاؤ کس حد تک مثبت اور ہمدردانہ رہا ہے۔ گزشتہ سال مجھے مولوی کریم الدین (۱۸۲۱ء - ۷۹) کی ایک کتاب پر مقدمہ لکھنے کی غرض سے ان کی تالیفات کے عمیق مطالعہ کا موقع ملا تو یہ حقیقت بھی سامنے آئی کہ وہ ہندی ادب کی پہلی تاریخ کے مولف بھی ہیں جس سے ابھی تک ہندی والے ناآشنا رہے ہیں۔

اردو میں تذکرہ نگاری کا فن اپنی جگہ پر بڑی اہمیت رکھتا ہے اور ہمارے تذکرے ہماری ادبی تاریخ کے اہم مآخذ ہیں لیکن ان تذکروں پر ادبی تاریخ کی اصطلاح صادق نہیں آتی۔ مشہور فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی کی کتاب "ہندوستانی ادب کی تاریخ" (۱۸۳۹ء) سے اردو تذکرہ نگاری ادبی تاریخ کے حدود میں داخل ہوئی اور پھر کریم الدین کے "طبقات شعرائے ہند" (۱۸۴۸ء) سے اردو والوں کو ادبی تاریخ کا واضح تصور بھی ملا اور اس کا ابتدائی نمونہ بھی۔ تقریباً یہی صورت ہندی میں بھی رہی ہے۔ ہندی میں وارتاؤں، بھگت مالوں اور سنگرہوں وغیرہ کو وہی حیثیت حاصل ہے جو اردو میں تذکروں کو ہے۔ ہندی کے ناقدین اور محققین بھی دتاسی کی مذکورہ کتاب کو ہندی ادب کی پہلی تاریخ تسلیم کرتے ہیں۔

دتاسی کی خدمات سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اس نے اپنی تاریخ کے مقدمے میں ادبی تاریخ کے جن اصولوں کی ہم نوائی کی تھی، اس کی تاریخ یکسر ان سے خالی ہے جس کا اس نے خود اعتراف کیا تھا۔ اس نے شعرا کا ذکر حروفِ تہجی کے لحاظ سے کیا اور ان کی زمانی تقسیم کا بالکل لحاظ نہیں کیا۔ طبقات شعرائے ہند دتاسی کی تاریخ پر مبنی ہے لیکن کریم الدین نے اس میں جو اضافے کیے ہیں وہ طبقات کو تاریخ بنا دیتے ہیں۔ در اصل طبقات دتاسی کے خواب کی تعبیر ہے۔ پھر یہی نہیں، آج دتاسی کی تاریخ جس مکمل شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے، وہ تدوین و تالیف کے کئی مرحلوں سے گزری ہے۔ اس نے ۱۸۳۹ء میں اس کی پہلی جلد شائع کی اور دوسری جلد ۱۸۴۷ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ اس کے بعد ۱۸۷۰ء میں اس نے تین جلدوں میں پوری کتاب دوبارہ شائع کی۔ یہی تینوں جلدیں آج ہندی والوں کے نزدیک ادبی تاریخ کا پہلا نمونہ قرار پائی ہیں۔ حقیقت حال یہ ہے کہ "طبقات شعرائے ہند" خود دتاسی کی تاریخ کا ایک اہم مآخذ ہے۔ اس نے نہ صرف یہ کہ اپنے مآخذ کی فہرست میں طبقات کا ذکر کیا ہے بلکہ کتاب کے مباحث میں کئی جگہ کریم الدین کے بیانات نقل کیے ہیں۔ اس طرح یہ نتیجہ نکالنا غلط نہیں کہ طبقات کو دتاسی کی مکمل تاریخ پر اولیت حاصل ہے اور اپنی ان ہی خصوصیات کے باعث یہ جہاں اردو کی ادبی تاریخ کا پہلا نمونہ ہے، وہیں خود ہندی کی بھی پہلی ادبی تاریخ ہے۔

طبقات اردو والوں کے لیے تو ایک جانی پہچانی کتاب ہے۔ ضرورت اس کی تھی کہ ہندی دنیا میں اس کا تعارف کرایا جائے۔ مقامِ مسرت ہے کہ شعبۂ ہندی، گورکھپور یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر رام چندر تیواری نے، جن کا ذوقِ تحقیق مسلم ہے، طبقات کے اس حصے کو جو ہندی شعرا اور مصنفین سے متعلق ہے، بڑی محنت سے مرتب کیا ہے۔ یہ کتاب دیوناگری رسم خط میں ضروری حواشی اور موصوف کے ایک طویل فاضلانہ مقدمہ کے ساتھ جلد شائع ہو رہی ہے۔[1]

ہندی زبان و ادب کے بارے میں میرا جو علم ہے وہ ثانوی ذرائع کا رہینِ منت ہے اس لیے اس کتاب کی قدر و قیمت کے بارے میں مجھے رائے دینے کا حق حاصل نہیں ہے پھر بھی ڈاکٹر تیواری نے اس کی ترتیب و تحشیہ کے دوران مجھ سے جن امور پر تبادلۂ خیال کیا اور ان کو اس باب میں ہندی کے بعض مقتدر محققین نے جو مشورے دیے ان سے میں نے یہ اندازہ ضرور لگایا کہ کریم الدین کے اس کارنامے کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ فارسی اور اردو میں ہندی زبان و ادب سے متعلق ایک نادر خزانہ محفوظ ہے جس پر ابھی تک کوئی کام نہیں کیا گیا۔ اسی طرح ابھی یہ بات عام نہیں کی گئی ہے کہ اردو نے جتنا مذہبی لٹریچر پیش کیا ہے، اس کی مثالیں مشکل سے ملتی ہیں۔ اردو کے ٹکسال سے کوئی شعر یا نثر کا کوئی ٹکڑا محض اس لیے ادبی نمونہ بن کر نہیں نکلا کہ اس میں کسی کے مذہبی احساسات کی جھلک ملتی ہے۔ اردو کی تنقیدی نگاہ قابلِ فخر حد تک بلند رہی ہے۔ مذہب کی آڑ لے کر کوئی شاعر یا ادیب اس کے احتساب کی زد سے نہ بچ سکا۔ اردو نے جن تخلیقات اور جن فکری کاوشوں کو ادبِ عالیہ کا درجہ دیا ہے ان میں سب سے زیادہ فعال نا مذہبی عناصر ہیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ ان نکات کو خالص علمی انداز میں پیش کیا جائے اور ایسا اسی وقت ہو سکتا ہے جب ہم تحقیق اور ریسرچ کو انفرادی طور پر نہیں بلکہ باہمی تعاون اور اشتراکِ عمل کے اصولوں پر آگے بڑھائیں۔ ہمارے یہاں ابھی مل جل کر تحقیقی کام کرنے کا چلن عام نہیں ہوا ہے بلکہ اس کے برعکس یہاں تو تحقیق کو ایک پراسرار فن بنا دیا گیا ہے۔ یہاں کا محقق بھی پراسرار رہتا ہے اور اس کا سرمایۂ تحقیق بھی!!

---

[1] ڈاکٹر تیواری نے ناگری پرچارنی سبھا بنارس کے لیے اسی موضوع پر ایک طویل مقالہ لکھا ہے جو سبھا کے ادبی مجلہ "ناگری پرچارنی پتریکا" کے کئی شماروں میں شائع ہو رہا ہے۔

محمد انصار اللہ نظر

چند نادر مخطوطات

پچھلے دنوں ریواں (مدھیہ پردیش) جانا ہوا، وہاں قاضی محمد علی خاں نبیرۂ خان بہادر حکیم مولوی رحمان علی مرحوم سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ خان بہادر مرحوم (۱۲۶۴ھ تا ۱۳۲۵ھ) تارہ کے رہنے والے تھے، ریواں کے راجہ رگھو راج سنگھ کی ملازمت اختیار کی اور مختلف اعزاز و امتیاز حاصل کیے۔ صاحب علم اور علم دوست انسان تھے متعدد کتب تصنیف کیں جن میں سے صرف چند شایع ہوئیں۔ کتب بینی کا شوق بھی کافی تھا چنانچہ بڑی تعداد میں کتابیں خود فراہم کیں۔ امتداد زمانہ سے بیشتر ضایع ہوگئیں چند مخطوطات کا جو محمد علی قاضی صاحب کے پاس محفوظ ہیں اجمالی تعارف سطور ذیل میں کرایا جاتا ہے

۱۔ مناظرۃ الحیوان:

یہ مخطوط نہایت خوشخط اور خوب صورت ہے، نہایت عمدہ کاغذ عام کتابی سائز طلائی حواشی سے مزین ہے، یہ اخوان الصفا کے اردو ترجمہ سے فارسی میں منتقل کیا گیا ہے۔ مترجم نے شروع کتاب میں اس کی کیفیت کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔

لالجی ولد سکھیل پرشاد قوم کایستھ۔۔۔ جو متوطن بلدہ آگرہ۔۔۔

۔۔۔ منشی شیو کمار جد امجد راقم را از ابتدائی تقرر رزیڈنٹی در ریاست بلدہ فاخرہ لکھنؤ عہد معدلت مہد نواب غفران مآب آصف الدولہ بہادر۔۔۔ از طرف سرکار دولتمدار کمپنی انگریز بہادر۔۔۔ بعہدہ وقایع نگاری سرکار نواب نامدار و سررشتہ داری ڈاک انگریزی سررشتہ ملازمی دست داد و بعد وفات شاں والدم منشی سکھیل پرشاد را بہ تقرر این عہدہ در کار گذاری سرکار تا مدۃ العمر اتفاق مداومت درین شہر افتاد و در ۱۸۲۱ عیسوی کہ انتقال والدم برگی روزگار بہ لکھنؤ رسید رفتن راقم کہ دراں اوان در پانزدہ سالگی بود بہ مولد وطن حسب تجویز۔۔۔ در ۱۸۲۹ عیسوی باز بہ سوم لکھنؤ اورد۔۔۔ بہ شرف ملازمت صاحب۔۔۔۔ کرنیل ابراہیم لاکٹ بہادر کہ دراں اوان بمنصب رزیڈنٹی لکھنؤ بہ بود۔۔۔ بہ پاس داشت مشرف شدم

۔۔۔ بخدمت سوروشی و عہدہ آبائی سرفراز گردیدم و از آن زمان تا آغاز ۱۸۵۱ عیسوی کہ مدت بست و دو سالی بہ شمار حساب می آید۔۔۔ خود را محسود ہمچشماں داشتم و درہماں ۱۸۵۱ عیسوی عہد دولت۔۔۔ سلطان عالم محمد واجد علی شاہ بادشاہ اودھ۔۔۔ کہ بیشتر حسن فراغ از شغل ضروری بمطالع کتب سیر و تواریخ می گذشت و اکثر صرف اوقات بدیں شغل می گشت روزی ترجمہ رسالہ اخوان الصفا کہ مولوی اکرام علی خیرآبادی خدا ایش بخشاد از زبان عربی بہ محاورہ اردو تحریر نمودہ بہ نظر در آمد و بخاطر گذشت کہ اگر ترجمہ این رسالہ از محاورہ اردو بہ زبان فارسی بہ عبارت سلیس و سریع الفہم صورت بندد ہر آئینہ مطالعہ و معانیہ حکایاتش موجب انبساط و دلبستگی عوام ظاہر بین و ادراک کو الیف دقایق و معارف الٰہی باعث احتظاظ خواطر دقیقہ شناسان باریک بین خواہد بود۔۔۔۔ و در عرصہ قلیل از زبان اردو بہ عبارت فارسی ترجمہ کردم و بہ مناظرۃ الحیوان موسوم نمودم۔۔۔۔

اس اقتباس سے اس عہد کے تواریخی حالات کا بھی کسی قدر اندازہ ہوتا ہے اور اس کتاب کے ترجمہ کیے جانے کے اسباب کا بھی پتا چلتا ہے۔ کتاب کے خاتمہ پر مترجم کے قطعہ تاریخ کے علاوہ منشی خیر اللہ ذرہ (تخلص) کا بھی ایک قطعہ تاریخ تحریر ہے جس سے ۱۲۶۸ ہجری سال تکمیل معلوم ہوتا ہے۔ کاتب کے نام اور زمانہ کتابت کا علم نہیں البتہ خیال ہے کہ شاید یہ مترجم کا نسخہ ہو جسے اس نے خاص طور پر لکھوایا تھا (یا لکھا تھا؟) نہیں کہا جاسکتا یہ کتاب شایع ہو سکی ہے یا نہیں

۲۔ قصہ چہار برادر

یہ مخطوطہ نسبتاً چھوٹے سائز پر لکھا گیا آخر کے جملے یہ ہیں جن سے کتاب کے متعلق تفصیلات معلوم ہوتی ہیں۔

۔ ارباب تصوف و اولی الالباب تعریف سراپا حالات را باز نمایند قصہ چہار برادر در علم تصوف حضرت قطب الاقطاب خزانہ واقف اسرار حضرت بی نیاز میراں سید محمد گیسو دراز قدس اللہ روحہ"

حضرت گیسو دراز کی شخصیت اردو کے محققین و درسیہ بین کے لیے خاص اہمیت رکھتی ہے ان کی تصانیف کے جو مخطوطہ ابھی تک دستیاب ہیں ان میں یہ نسخہ ان کے علاوہ ہے لیکن کاتب اور سال کا اندراج مخطوطہ پر کہیں نہیں

(بقیہ صفحہ ۱۰ پر)

ملہ خان بہادر صاحب کی ایک فارسی تصنیف تذکرہ علمائے ہند محمد ایوب قادری کے ترجمہ اور حواشی کے ساتھ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی سے کراچی سے ۱۹۶۱ء میں بھی شایع ہو چکی ہے۔

غزلیں

واحد پریمی

دلِ حزیں کے شرارو انھیں تلاش کرو
شبِ الم کے ستارو انھیں تلاش کرو
وہ جن کے رُخ سے کہیں رنگ و نور ملتے ہیں
اُداس اداس نظارو انھیں تلاش کرو
غمِ حبیب سے تم آسودہ ہو نہیں سکتے
نظر کے بادہ گسارو انھیں تلاش کرو
بڑا سکون رہِ جستجو میں ملتا ہے
غمِ حیات کے مارو انھیں تلاش کرو
ہر ایک پھول فسردہ ہے غنچہ غنچہ اداس
خزاں گزیدہ بہارو انھیں تلاش کرو
شبِ فراق اگر تم ہو میرے غم میں شریک
تو ڈوبتے چاند ستارو انھیں تلاش کرو
بہت نڈھال ہوں اب تم ہی کچھ سہارا دو
رہِ طلب کے غبارو انھیں تلاش کرو
تسلیِ دلِ واحد سے کچھ نہیں حاصل
جو چارہ کرنا ہے یارو انھیں تلاش کرو

احمد وقار واثقی

تجھ بھی اب نہیں رہی جو ہونٹوں کے زہر میں
اُڑتی ہوئی سی ہے تمہارے ہی شہر میں
ہے انتظام آج کے جشن کا بھی یہی
مشغول کو نگن وہ ہے تعمیرِ نہر میں
ہر موڑ پر گمان ہے کوچۂ حبیب کا
کتنے عجیب موڑ ہیں ظالم کے شہر میں
اک دل کے ڈوب جانے پہ حیرت نہ کیجیے
ہوتا ہے حسن بھی تو سمندر کی لہر میں
اچھا ہوا کہ چھین لیے دامن کشاں تم آج
پل بھر بچی ہوئی تھی امیدوں کے شہر میں

قوی نوشی

حاصلِ زیست ہے ناکامِ تمنا ہونا
موت ہے دردِ محبت کا مداوا ہونا
چھوڑ دیتا ہوں ترے کشتۂ غم یہ سوچ کر
میرا مسلک نہیں منت کشِ صہبا ہونا
پھونک کر میرے نشیمن کو چراغاں کر دو
صحنِ گلشن میں مقدم ہے اجالا ہونا
شکریہ اے مرے افسوں کاری چشمِ ساقی
ورنہ دشوار تھا بیگانۂ دنیا ہونا
تنگ آدابِ محبت ہیں جنوں کی رسمیں
میری فطرت نہیں آوارۂ صحرا ہونا
اہلِ ساحل کی طبیعت پہ گراں گزرا ہے
میری کشتی کا تلاطم سے شناسا ہونا
لذت آمیز خلش بخش گیا ہے کوئی
ہو مبارک تو قوی ناکامِ تمنا ہونا

اردو محافظ دستے سے وزیر اعلیٰ یو۔پی کی ملاقات

لکھنؤ ۱۰ اپریل۔ اردو محافظ دستے کی علامتی بھوک ہڑتال جو کل صبح سے کونسل ہاؤس کے سامنے شروع ہوئی تھی آج ۸ بجے صبح ختم ہو گئی۔

سہ پہر کو اردو محافظ دستے کے ایک وفد نے جس کی قیادت نواب انصر حسین ایڈوکیٹ نے کی۔ ریاستی وزیر اعلیٰ شریمتی سچیتا کرپلانی سے ملاقات کی اور انھیں ایک عرضداشت پیش کی جس میں مطالبہ کیا گیا کہ اردو کو دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے اتر پردیش میں تسلیم کیا جائے۔

عرضداشت میں کہا گیا ہے کہ اردو محافظ دستے نے علامتی بھوک ہڑتال کر کے ایک پہلا عملی قدم اٹھایا ہے کیوں کہ آج تک اردو کو اس کا جائز مقام دیے جانے سے متعلق جس قدر کوششیں کی گئیں ہیں ان کے نتیجے میں زبانی وعدوں کے سوا اردو والوں کو اور کچھ نہیں ملا۔ اس لیے اس بات کا مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ ریاستی حکومت اس سلسلے میں اپنی واضح پالیسی کا اعلان کرے۔

عرضداشت میں کہا گیا ہے کہ اگر مطالبات تسلیم نہ کیے جائیں گے تو ریاستی پیمانے پر آئینی اور جمہوری طریقوں پر اردو کا جائز حق دلوانے کے لیے تحریک شروع کی جائے گی۔

معلوم ہوا ہے کہ وزیر اعلیٰ نے وفد کے ممبران کو یقین دلایا کہ وہ عرضداشت میں کہی گئی باتوں پر غور کریں گی لیکن انھوں نے وفد کے ممبران سے کہا کہ وہ اس مرحلے پر جب کہ ملک میں ہندی اور انگریزی کا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا ہے، کسی قسم کا کوئی خاص وعدہ نہیں کر سکتی ہیں۔

وفد کی شکایات سن کر انھوں نے ممبران کو یقین دلایا کہ اگر کہیں اردو کی درخواستیں وغیرہ قبول کیے جانے میں دقتیں پیش آ رہی ہوں تو انھیں مطلع کیا جائے۔ حکومت اس سلسلے میں ضروری کارروائی کرے گی۔ انھوں نے وفد کو بتایا کہ اردو کے سلسلے میں ریاستی حکومت کی وہی پالیسی ہے جو ۵ سال قبل تھی۔

انھوں نے وفد کی اس رائے سے اتفاق نہیں کیا کہ اردو کا معاملہ کابینہ کے کسی جلسے میں پیش کیا جائے اور وزارتی سطح پر اس کا ردِ عمل معلوم کیا جائے۔　(قومی آواز)

مراسلات

اردو کے مسئلے پر عمل کی ضرورت ہے

جنوبی ہند میں زبان کے مسئلے پر خونی تحریک کے پس منظر میں خواہ کوئی بھی طاقت، گروپ یا پارٹی سرگرم عمل رہی ہو، اس سے بحث کرنا بے محل ہے۔ لیکن یہ بات طے ہے کہ ہماری جمہوری حکومت خود کسی بھی مسئلے کے خوشگوار اور مثبت پہلو سے چشم پوشی اختیار کرتی چلی آرہی ہے، اور اپنے لیے قدم قدم پر نئے مسائل پیدا کر رہی ہے۔ حکومت کی بے عملی اور بد عنوانی کی یہ انتہا ہے کہ وہ خود جو قانون، قواعد اور دستور مرتب کر چکی ہے اس پر عمل نہیں کیا جا رہا، اور جب دستور کے مطابق جائز مطالبات کیے جاتے ہیں تو وزیر اعظم سے لے کر، کابینہ کے وزراء اور دوسرے ذمہ دار اراکین تک صرف اخباری بیانات پریس کانفرنس میں طفل تسلیوں اور نشری تقاریر کے ذریعے محض یقین دہانیوں پر اکتفا کرتے ہیں۔ آج جب کہ ہندوستان سرحدی خطرات اور کشمیر جیسے پیچیدہ تنازع سے دوچار ہے ضرورت ہے کہ اندرونی خرابیوں کو جلد سے جلد دور کیا جائے۔ تاکہ عوام میں اطمینان، سکون اور اعتماد پیدا ہو سکے۔ اور تمام طاقتیں مجتمع و متحدہ ہو کر بیرونی خطرات کا مقابلہ کر سکیں، جس پر ملک کی ترقی، سالمیت اور جمہوریت کے استحکام کا انحصار ہے، ضرورت نہیں کہ اس وقت ان تمام حالات و مسائل سے بحث کی جائے۔ جنھیں سترہ سال سے ہندوستان کے غریب عوام اپنے وطن کی بہبودی اور تعمیری مقاصد کے پیش نظر برداشت کرتے چلے آرہے ہیں جنھیں فاقہ کشی، بیروزگاری، فرقہ پرستی، نامساوات، نوکر شاہی اور ایسے ہی ان گنت تحائف سے قدم قدم پر مالا مال کیا گیا ہے۔

مذکورہ بھی اہم ترین مسائل میں سے ایک مسئلہ زبان کا بھی ہے، جسے دستور ہند میں شامل کرنے کے باوجود ایک سترہ سال گزر جانے کے بعد بھی معرض التوا میں ڈال رکھا ہے۔ اور قانون کی رو سے دیئے گئے حقوق پر عمل درآمد نہیں کیا جا سکا جس کے نتیجے میں مجبور ہو کر جنوبی ہند کے باشندے اپنی جانوں پر کھیل گئے۔ لیکن افسوس کی بات ہے کہ ہماری جمہوری حکومت نے ان جائز مطالبات اور قانون کو نظر انداز کر کے اپنی طاقت کا استعمال کیا، اور لاتعداد افراد کو گولی اور مشین گنوں سے اڑایا اور اس کے نتیجے میں حکومت کو لاکھوں کا مالی نقصان بھی ہوا۔

جبکہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ آئین اور دستور کی روشنی میں انھیں وہ سہولتیں دی جاتیں جن کی آنجہانی وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے متعدد بار یقین دہانی کی تھی اور فوری طور پر عمل درآمد کا وعدہ کیا تھا۔ یقین کے ساتھ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ سرکاری زبان ہندی کے ساتھ دوسری علاقائی زبانوں کا بھی تحفظ ملحوظ رکھا جاتا تو ہندی کے خلاف اس شدت سے نفرت کا اظہار نہ کیا جاتا اور نہ ہی زبان کے سلسلے میں تحریک یہ بھیانک رخ اختیار کرتی۔ انگریزی کو بلاشبہ ختم ہونا چاہیے۔ لیکن جمہوری حکومت میں انانیت پرستی اور شہنشاہیت کے کسی بھی عمل کو دہرایا نہیں جا سکتا ہر مسئلے میں سنجیدگی اور نرمی کا برتاؤ ضروری ہے۔ ہندی بھارت ملک کی سرکاری زبان قرار پا چکی ہے، اس کے خلاف نفرت کا اظہار وطن پرستی کے منافی ہے۔ بلکہ اپنے ملک سے غداری ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہندوستان کے مختلف صوبوں اور علاقوں میں دوسری بولی، سمجھی، اور پڑھی لکھی جانے والی زبانوں کو ختم کر دیا جائے یا ان کی جانب سے ٹال مٹول کر کے عدم توجہی کا ثبوت دیا جائے۔ اور ایسی صورت میں جبکہ دستور میں بھی ان چودہ علاقائی زبانوں کو تسلیم کر کے انھیں برقرار رکھنے کا فیصلہ کیا جا چکا ہے۔ اور یہ طے ہو چکا ہے کہ سرکاری زبان کے علاوہ ہندوستان کی ان چودہ زبانوں کو بھی مساوی حقوق حاصل ہوں گے۔ لیکن اس کے برعکس تمام علاقائی زبانوں کے ساتھ حکومت اور تمام سرکاری و نیم سرکاری اداروں میں سخت ناروا سلوک کیا جا رہا ہے۔ اس ضمن میں خصوصیت سے اردو کے ساتھ جو سخت گیر پالیسی اختیار کر رکھی ہے وہ حد درجہ غیر جمہوری اور غیر آئینی ہے۔ اس تعصب اور اردو دشمنی کے مظاہرے میں مدھیہ پردیش سب سے آگے ہے۔ جہاں کسی بھی دفتر یا ادارے میں اردو تحریر قبول نہیں کی جاتی جبکہ ایک بدیشی زبان انگریزی کے ساتھ یہ رعایتیں برتی جاتی ہیں۔ اگرچہ جامعہ اردو کے امتحانات کو سرکاری پیمانے پر تسلیم کیا جا چکا ہے، لیکن ایسی کوئی مثال پیش نہیں کی جا سکتی کہ جامعہ اردو سے فارغ التحصیل طالب علم کو کہیں ملازمت دی گئی ہو یا تسلیم شدہ مراعات کو بروئے کار لایا گیا ہو حقوق تلفی کی اس سے بدترین مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ آل انڈیا ریڈیو، انفارمیشن پبلسٹی، پلان پبلسٹی یا میونسپل وغیرہ جن کا زیادہ تر تعلق عوام سے ہے بیشتر مقامات پر ان محکمات میں اردو کا نام و نشان تک موجود نہیں ہے۔ مذکورہ بالا اداروں سے جو اطلاعات صرف عوام کی آگاہی کے لیے نشر و اشاعت کی جاتی ہیں۔ ان کی زبان عوام کی فہم و فراست سے بعید ہوتی ہے اس طرح صوبہ مدھیہ پردیش کا لنگویج ڈپارٹمنٹ اردو کے فنکاروں [illegible] کے مجموعوں کی اشاعت کے لیے مسودات قبول نہیں کرتا۔ لنگویج ڈپارٹمنٹ کی اردو دشمنی کا تو یہ عالم ہے کہ اردو کے لکھنے والوں کے ہندی زبان دیوناگری رسم الخط میں مسودات واپس کر دینا ہی نہیں بلکہ اس ادارے نے

یک جو ہزاروں روپیہ کے انعامات تقسیم کیے یا کتابوں کی اشاعت کے لیے رقم دی ہے ان میں اردو کے ایک بھی ادیب یا شاعر کا نام موجود نہیں ہے سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ تمام بدعنوانیاں ہندوستان کی جمہوریت کے لیے نیک نامی کا باعث بن سکتی ہیں؟ یا ان مسائل کو حل کیے بغیر قومی یکجہتی کا تصور فروغ پا سکتا ہے۔ قومی یکجہتی کا بنیادی مقصد ہے مختلف تہذیبوں اور زبانوں کا اٹوٹ رشتہ جس کے بغیر باہمی میل ملاپ اور اتحاد کا تصور بھی مشکل ہے ہندوستان جو زمانۂ قدیم سے مختلف مذاہب، رسم و رواج، تہذیبوں اور زبانوں کا گہوارہ رہا ہے۔ آج ہماری جمہوریت اس کی ریشمی ڈوریوں کو کاٹ رہی ہے۔ اور اپنی بے عملیوں، چشم پوشی اور کوتاہیوں سے ان اعلیٰ تہذیبی رابطوں میں انتشار پیدا کر کے قومی یکجہتی کا نعرہ دے رہی ہے ہندوستان میں جہاں دوسری علاقائی زبانوں میں تہذیبی، تمدنی اور ادبی سرمایہ موجود ہے وہیں اردو زبانوں میں بھی ناقابل فراموش، ادبی ثقافتی و مشرقی بیش بہا خزانہ موجود ہے جس کی حفاظت بقا اور ترقی کی ذمہ داری ہر اردو داں پر فرض ہے اور آج اس فرض کی ادائیگی کے لیے ہندوستان کے کروڑوں انسان میدان عمل میں آ گئے ہیں۔ جو اپنے وزیر اعظم لال بہادر شاستری کی تلقین کے مطابق جمہوریت کے احترام کے ساتھ جائز طور پر آئین و دستور کے سہارے اردو کو دوسری سرکاری اور علاقائی زبان بنانے کا پُر زور لیکن پُر امن مطالبہ کر رہے ہیں۔

قومی امید ہے کہ اردو کے مسئلے کو اب زیادہ عرصے کے لیے نہیں ٹالا جائے گا جس کے مطالبے کے لیے آج ہندوستان کے کروڑوں انسان جن میں ہندو، مسلمان، سکھ اور عیسائی ہر طبقے کے لوگ شامل ہیں، میدان عمل میں آ گئے ہیں۔

(عشرت قادری)

یو۔پی میں اردو ٹیچر

حال ہی میں شریمتی سوچیتا کرپلانی وزیر اعلیٰ یو۔پی نے اتر پردیش اسمبلی میں بیان دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ اتر پردیش میں موجودہ تعلیمی سال کے آغاز میں ۵،۵ اردو ٹیچروں کا تقرر کیا گیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ اعلان اردو کے بہی خواہوں کے لیے بہت ہی اطمینان بخش ہے اس لیے کہ سترہ سال کے عرصہ میں حکومت یو۔پی کی جانب سے اردو کی تعلیم کے لیے جائز سہولتوں کی فراہمی کے سلسلے میں یہ پہلا اقدام ہے مگر ہمیں افسوس کے ساتھ یہ بھی عرض کرنا پڑتا ہے کہ اس اقدام کا انجام بھی تقریباً وہی کچھ ہو چکا ہے جو اس سے قبل اردو کے سلسلے میں ہمارے لیڈروں کی یقین دہانیوں اور وعدوں کا ہوا ہے پورے صوبہ کو تو جانے دیجیے صرف ضلع فیض آباد کی مثال ہمارے سامنے ہے جہاں گذشتہ جولائی میں پانچ اردو ٹیچروں کا تقرر کیا گیا اور پانچ ماہ بعد ہی انہیں یہ کہہ کر ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا کہ وہ ان ٹرینڈ (Untrained) ہیں اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ٹریننگ (Training) کی شرط تقرر کے وقت کیوں حافظے میں نہیں تھی اور اگر مطلوبہ تعداد میں ٹرینڈ (Trained) اساتذہ نہ مل سکے تو پھر اردو اساتذہ کی ٹریننگ (Training) کا انتظام کیوں نہیں کیا گیا اور عبوری دور کے لیے (Untrained) ان ٹرینڈ اساتذہ سے ہی کام چلانے کا فیصلہ کیوں نہیں کیا گیا یہ سب کچھ تو اسی شکل میں ممکن تھا جبکہ اردو کے ساتھ حقیقی معنوں میں ہمدردی ہوتی جو اس صوبہ کی مقبول عام زبان اور اس ملک کے دو کروڑ سے زائد باشندوں کی مادری زبان ہے۔

اردو کے معاملے میں حکومت یو۔پی کے اس طرح کے رویہ نے اس زبان کو گذشتہ سترہ سال میں سخت نقصانات پہونچائے ہیں، آج جبکہ زبان کا مسئلہ پھر ایک بار سب کے سامنے پوری شدت کے ساتھ آ گیا ہے اردو والوں کا پرانا زخم پھر سے تازہ ہو گیا ہے۔ اور وہ اس زبان کو یو۔پی کی علاقائی زبان بنانے اور اس کی تعلیم کے لیے تمام سہولتوں کی فراہمی کے مطالبہ کو لے کر اٹھ گئے ہیں۔ ملک کے موجودہ مسائل اور نازک حالات کا تقاضہ ہے کہ اس طرح کی بے انصافیوں کو ختم کر کے قومی اتحاد کو مضبوط بنانے کی کوشش کی جائے اور یہ اس وقت تک ناممکن ہے جب تک دستور میں درج جملہ زبانوں کو ان کا جائز حق نہیں دیا جاتا۔

(جمال احمد، سکریٹری انجمن ترقی اردو ضلع فیض آباد)

ایس۔ کے۔ بی۔ راؤ

اردو کے ساتھ سوتیلے پن کا سلوک

یوپی کی سات کروڑ آبادی میں سے دو کروڑ سے زیادہ افراد کی مادری زبان اردو ہے اس کے باوجود ابھی تک اسے دستور نے تسلیم نہیں کیا۔ کانگریسی قیادت ہمیشہ یہی کہتی رہی ہے کہ اردو ذرا سے فرق کے ساتھ ہندی ہی ہے لہٰذا اس کو علیحدہ زبان کی حیثیت سے تسلیم کرنے کی ضرورت نہیں۔ حالانکہ دستور میں درج شدہ چودہ زبانوں میں اردو بھی شامل ہے۔ لیکن اس کے بولنے والوں کا کوئی علاقہ نہیں ہے۔ جیسے تامل اور تلگو بولنے والوں کی اپنی ریاستیں ہیں۔ تلگو بولنے والی ریاست آندھرا میں اردو کو آئینی طور سے تسلیم کیا گیا ہے حالانکہ یہاں اردو بولنے والوں کی تعداد یوپی سے بہت کم ہے۔ ڈاکٹر سمپورنانند جب یوپی کے وزیر اعلیٰ تھے تو ان کے اس دعویٰ کو اردو کے اسکالروں نے چیلنج کیا تھا کہ اردو محض ایک بولی ہے یا ہندی کی ذرا سی تبدیل شدہ شکل ہے۔ چیلنج کرنے والے ان لوگوں میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی ان سب کو یہ غم تھا کہ ریاستی حکومت اردو کے ساتھ سوتیلی ماں جیسا برتاؤ کر رہی ہے وہ کہتے ہیں کہ آندھرا جیسی غیر ہندی ریاست میں اردو کے تسلیم کر لیے جانے کے باوجود بھی یوپی نے اسے تسلیم نہیں کیا جہاں اردو بولنے والوں کی تعداد آندھرا سے کہیں زیادہ ہے۔

اردو زبان کا مسئلہ ایک بار پھر بڑھ کر سامنے آگیا ہے۔ یوپی کے ۳۲ ممبران لیجسلیچروں نے کانگریس لیجسلیچر پارٹی کی خدمت میں درخواست پیش کی کہ اپنے اپنے حلقۂ انتخاب کی نمائندگی کے لیے ان کو اردو بولنے کی اجازت دی جائے۔ لیکن یہ درخواست مسترد کر دی گئی۔ بلاشبہ ریاست کی سرکاری زبان ہندی ہے لیکن ایوان کے چیئرمین یا اسپیکر کو اختیار ہے کہ وہ چاہے تو ممبران کو اگر وہ سرکاری زبان سے ناواقف ہیں تو ان کی مادری زبان میں تقریر کرنے کی اجازت دے سکتا ہے۔ لیکن اس ایکٹ کا انطباق کرتے وقت انتہائی تنگ نظری کا ثبوت دیا گیا اور کسی کو بھی ہندی کے علاوہ کوئی زبان استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ بہار اسمبلی میں جب ایک ممبر نے کہا کہ وہ ہندی میں پوری طرح اپنا مافی الضمیر ادا نہیں کر سکتا جو ریاست کی سرکاری زبان ہے تو اسے انگریزی میں بولنے کی اجازت دے دی گئی۔ لیکن جس عالی حوصلگی کا ثبوت ایک ہندی ریاست نے دیا وہ دوسری نہیں دے رہی۔ اس طرح پچاس سے زائد ممبران جن کو عوام نے منتخب کر کے بھیجا ہے ایوانوں میں منہ بند کیے بیٹھے رہتے ہیں۔ ووٹروں نے ان کو لیجسلیچر میں اپنی نمائندگی کا اہل قرار دے کر بھیجا لیکن خود لیجسلیچر نے اپنے ہی ایک ایکٹ کے ذریعہ ان کو اس نمائندگی سے محروم کر دیا۔ یہ بات ہندوستانی جمہوریت کے خلاف ہے کہ مادری زبان بولنے کے خلاف کسی پر پابندی عائد کر دی جائے۔ اترا علاقہ بیلنڈ کے مشہور سماجی کارکن ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی نے جو کونسل کے ممبر ہیں فیصلہ کیا ہے کہ جب تک لیجسلیچر میں اردو بولنے کی اجازت نہیں دی جائے گی وہ ایوان سے باہر رہیں گے انھوں نے ایک خط میں چیئرمین کو لکھا ہے۔

میں اس ہندی سے واقف نہیں ہوں جو حکومت یوپی استعمال کرتی ہے اور میرے علاوہ کئی دوسرے ممبر بھی اسے سمجھنے سے قاصر ہیں ہندی کا اس طرح استعمال ملک کی دوسری زبانوں اور دوسری ثقافتوں پر ظلم کا آئینہ دار ہے۔

فی الواقع کانگریس جن سنگھ سے جو صوبہ میں سر اٹھا رہی ہے اس درجہ خائف ہے کہ وہ ایک آزادانہ روش اختیار نہیں کر سکتی گزشتہ عام انتخابات میں اس نے اسمبلی کی پچاس نشستوں پر کامیابی حاصل کی اور پہلی حزب اختلاف بن گئی۔ لوکل باڈیز کے حالیہ انتخابات میں بھی اس نے خاصی اکثریت حاصل کی ہے۔ کانگریسی قیادت محسوس کرتی ہے کہ اگر اس وقت اردو کی ذرا بھی حوصلہ افزائی کی گئی تو جن سنگھ جو مذہبی جذبات سے اپیل کرتی ہے عوام کو کانگریس کے خلاف مشتعل کر دے گی۔ اور یہ اکھاڑ پھینکے گی۔ یہی خوف ہے جس کی وجہ سے کانگریس نے اردو کے بارے میں یہ رویہ اپنا رکھا ہے اگر اردو محض ایک بولی ہے یا ذرا سے فرق کے ساتھ ہندی کی ایک شکل ہے تو دستور نے اسے کیوں تسلیم کیا؟ اس کا کوئی جواب نہیں۔ یہی خوف ہے جس کی وجہ سے لسانی فارمولے سے صرف نظر کر کے جسے تمام وزرائے اعلیٰ نے تیار کیا تھا۔ اس میں سنسکرت کو جدید زبان کی حیثیت سے شامل کر دیا گیا۔

اس کی غرض و غایت محض انتہا پسندوں کو خوش کرنا ہے اب جبکہ وزرائے اعلیٰ ہندی والی ریاستوں میں سہ لسانی فارمولا پر عمل درآمد کرنے پر رضامند ہو گئے ہیں تو ریاستی حکومت گومگو کے عالم میں ہے۔ اردو بولنے والے لوگوں نے پہلے سے مطالبہ پیش کر رکھا ہے کہ اردو کے ساتھ ہونے والی بے انصافی کی تلافی کی جائے۔ اور سہ لسانی فارمولے میں اسے تسلیم کیا جائے۔

اس وقت یوپی کانگریس کے صدر پنڈت کملاپتی ترپاٹھی ایک دلچسپ تجویز لے کر آئے کہ تامل کو معاون زبان بنا دیا جائے ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں پنڈت ترپاٹھی کی یہ عالی ظرفی یقیناً داد کی مستحق ہے۔ لیکن اس شکل میں کہ ریاست اپنی ہی ایک زبان اردو کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں یہ پیشکش مسخرے پن سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ اور کوئی بھی اس پر سنجیدگی سے غور نہیں کرے گا ہندی سامراج نے اپنے مخالفین کو شکست دینے کے لیے طرح طرح کی ترکیبیں ایجاد کر رکھی ہیں۔

(ترجمہ)

شاخ پنجاب کے جنرل سکریٹری کی گورنر سے ملاقات

۲۹ مارچ آج پنجاب کے گورنر حافظ محمد ابراہیم صاحب سے راج بھون چنڈی گڑھ میں انجمن ترقی اردو ہند شاخ پنجاب کے جنرل سکریٹری شری اوم پرکاش ملک نے ملاقات کی ملاقات تقریباً ساٹھ منٹ تک جاری رہی جس کے دوران شری ملک نے جناب گورنر صاحب کی توجہ مبذول کراتے ہوئے کہا کہ پنجاب سرکار نے ۱۳ اکتوبر ۱۹۶۷ء کے بعد عدالتوں اور دفاتر سے اردو زبان کے استعمال کو بند کر کے ملک کی جمہوری قدروں کو ذبح کیا ہے کیوں کہ اس وقت پنجاب کے عوام میں سب سے زیادہ استعمال میں آنے والی زبان صرف اردو ہی ہے اس وقت پنجاب سرکار کے لسانی فارمولوں کے سبب پڑھے لکھے لوگ ان پڑھ بن گئے ہیں۔

گورنر صاحب سے شری ملک نے مانگ کی کہ پنجابی یونیورسٹی کو چاہیے کہ وہ ادیب فاضل طلبا کو اتنی سہولت دے جو پربھاکر اور گیانی پاس طلبا کو مل رہی ہے گیانی اور پربھاکر پاس طلبا پرائیویٹ طور پر اس یونیورسٹی سے بی۔ اے کر سکتے ہیں جب کہ ادیب فاضل پاس طلبا ایسا نہیں کر سکتے۔

شری ملک نے گورنر صاحب سے مانگ کی کہ پنجاب سرکار کے محکمہ السنہ (زبانوں کے محکمہ) میں ہندی اور پنجابی زبانوں کی بہتری کے لیے مخصوص کی گئی رقم کے ساتھ اردو زبان کے لیے رقم مخصوص ہونی چاہیے اور اردو زبان کے لیے بھی الگ شعبہ قائم کیا جانا چاہیے۔

شری ملک نے ہی یونیورسٹی چنڈی گڑھ کے اس جس کی رو سے آئندہ طلبا پربھاکر، گیانی اور ادیب فاضل کرنے کے بعد بی۔ اے۔ پرائیویٹ طور پر کر سکتے کی طرف بھی توجہ مبذول کرائی کیونکہ اس سے تعلیم کے پھیلاؤ میں یقینی طور پر رکاوٹ پڑے گی اور غریب اور مستحق طلبا زیادہ تعلیم حاصل نہ کر سکیں گے شری ملک نے مطالبہ کیا کہ یونیورسٹی کو سابقہ رعایت جاری رکھنی چاہیے۔

معلوم ہوا ہے کہ جناب گورنر صاحب نے تمام باتوں کو بڑی دلچسپی کے ساتھ سنا۔ اور یقین دلایا کہ کی گئی زیادتیوں کو بہت جلد دور کرانے کی کوشش کی جائے گی۔ اور ہر زبان کے ساتھ انصاف برتا جائے گا۔

یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ان امور کی روشنی میں جناب گورنر صاحب بہت جلد محکمہ تعلیم کے سکریٹری، محکمہ السنہ کے ڈائرکٹر جنرل، پنجاب یونیورسٹی کے اور پنجابی یونیورسٹی کے وائس چانسلروں کو بلا رہے ہیں۔ تاکہ مناسب حل تلاش کیا جائے۔

شری ملک نے ایک بیان میں کہا کہ گورنر صاحب سے ان کی ملاقات نہایت تسلی بخش ماحول میں ہوئی ہے اور انہیں یقین ہے کہ جناب گورنر صاحب مناسب انصاف فرمائیں گے۔

(اوم پرکاش)

اردو مجلس حیدر آباد کا ایک جلسہ

اردو مجلس کے زیر اہتمام ۲۸ مارچ ۱۹۷۵ء کو شام کے ۵½ بجے اردو ہال میں محفل ادب منعقد ہوئی جس کی صدارت حیدرآباد کے مشہور شاعر مرزا شکور بیگ نے کی۔ جناب بھارت چند کھنہ نے "اردو شاعری کا محبوب" اور جناب مجتبیٰ حسین نے "تقریب چار گریجویٹ دردیشاں" کے زیر عنوان اپنے مزاحیہ مضامین سنائے جنھیں بے حد پسند کیا گیا۔

اردو مجلس کی اس گنگا جمنی محفل میں یہ بھی ایک خوب صورت اتفاق تھا کہ اسی موقع پر مشہور افسانہ نگار محترمہ آمنہ ابوالحسن کی کتاب "کہانی" کی رسم اجرائی جناب مخدوم محی الدین کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ مخدوم صاحب نے کہا کہ آمنہ کی کہانیاں اپنے ہی سماج اور ماحول سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہیں۔ عالم خوند میری صاحب نے کہا کہ سلجھا ہوا ترقی پسند رجحان رکھتے ہوئے بھی آمنہ اپنے فن پر پورا قابو رکھتی ہیں۔

اس کے بعد جن شعرا صاحبان نے اپنے کلام سے لطف اندوز ہونے کا موقعہ دیا وہ یہ ہیں:۔

مخدوم محی الدین، فیض الحسن خیال، رحمیں اختر، برق یوسفی، صلاح الدین نیر، حکیم یوسف حسین خان۔ اور طالب رزاقی۔

اس کے بعد مرزا شکور بیگ صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں فن مزاح پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ طنز و مزاح کی حدیں مقرر ہیں اور ان سے آگے بڑھ جانے سے مزاح میں بے لطفی پیدا ہو سکتی ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اردو دنیا میں مزاح کی بہت کمی محسوس ہوتی ہے۔ انھوں نے اس فن کو آگے بڑھانے کی ضرورت پر زور دیا۔

ابتدا میں صدر اردو مجلس جناب جانکی پرشاد نے خیر مقدم کیا اور آخر میں فاطمہ عالم علی سکریٹری اردو مجلس کے شکریے پر یہ محفل اختتام کو پہونچی۔

(سکریٹری اردو مجلس)

ہماری زبان

کو مضامین و مراسلات ارسال کرتے وقت یہ خیال رکھیں کہ کاغذ کے ایک طرف لکھے ہوں۔

(بقیہ صفحہ ۴ سے آگے)

۳۔ تواریخ تحصیل کھنڈہ

اس کتاب کے مولف مولوی رحمان علی خاں مرحوم ہیں شروع میں مولف نے وجہ تالیف لکھی ہے:

"ایک روز مولف اوراق حضور میں جناب فیض مآب قدر دان اہل علم ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر پولیٹیکل ایجنٹ تحصیل کھنڈہ دسپرنٹنڈنٹ راج ریوان کی باریاب ہوا ۔ ۔ ۔ فرمایا کہ اب تک اس ملک کی کوئی تاریخ دیکھی نہیں، ہم نے سنا ہے کہ آپ یہاں کی تاریخ لکھتے ہیں عرض کیا بعد تکمیل حضور والا میں پیش کروں گا چنانچہ تواریخ تحصیل کھنڈہ پوری ہو چکی حضور ممدوح میں پیش کرتا ہوں ؎

گر قبول افتد زہی عز و شرف"

(ص ۲)

کتاب دو حصص پر مشتمل ہے خاتمہ میں اس کی تاریخ کے چند مادّے درج کئے ہیں وہ یہ ہیں:

تواریخ عجیب ۱۳۰۲ھ

تواریخ تحصیل کھنڈ نہایت خوشتر ۱۳۰۲ھ (ص ۲۹۵)

اس کے بعد سرگذشت مولف کتاب (ص ۲۹۶ تا ص ۳۰۴) بھی تحریر ہے۔ یہ کتاب ابھی تک شائع نہیں ہو سکی ہے معلوم ہوا کہ اس کی اشاعت میں بعض موانع ہیں۔ راجگان ریوان کے حالات میں یہ کتاب یقیناً قابل قدر ہے۔

۴۔ قانون:

یہ وہ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے ترقیمہ کی عبارت اس طرح ہے۔

"تم الکتاب الثانی من القانون فی الادویۃ المفردۃ تالیف الرئیس ابو علی بن سینا عفا اللہ عنہ"

صرف دو سری جلد کی ضخامت ۵۰۰ صفحات ہے۔ جلد کی تحریر دونوں میں سے ایک محرم الحرام ۱۰۰۱ھ ہے اگر اس کو کسی شخص کے مطالعہ کی تاریخ سمجھیں تو مخطوطہ کی غیر معمولی قدامت ظاہر ہے۔ یہ جلد کی تحریر اس قدر شکستہ ہے کہ اس کو پڑھنا دشوار ہے اس سے کوئی قطعی بات کہنا مشکل ہے۔

۵۔ سعادۃ الکونین

یہ بھی ایک فارسی کتاب کا مخطوطہ ہے۔ ترقیمہ یہ ہے۔

"بتاریخ پانزدہم شہر ذی قعدہ سنہ یکہزار و دو صد و بست و نہ ہجری مرقوم شد مطابق سنہ ۔ محمد اکبر شاہ تمت تمام شد تمام الخیر"

کاتب مقام کتابت اور مصنف کے نام کا پتا نہیں۔

۶۔ سلسلۃ الذہب

یہ حضرت جامیؒ کی تصنیف ہے چھوٹی سائز پر کسی محمد منور نامی شخص نے اسے نقل کیا ہے۔

ترقیمہ:

"تمت تمت الکتاب بعون ملک الوہاب حسب الفرمائش عالی منزلت ستودہ خصلت مشیخت پناہ فضیلت دستگاہ ملا محمد نظر مرغلانی (کذا) بہ دست حقیر الفقیر اضعف العباد محمد منور عرف زیکر (کذا) کشمیری (؟) فرد

ہر کہ خواند دعا طمع دارم
زانکہ من بندہ گنہگارم

التماس از ارباب معرفت اساس اگر سہوی و خطائی در نظر آید بہ دیدہ عفو در پوشند ۱۲۱۳ھ"

ملا محمد کی شخصیت کے متعلق کوئی اطلاع نہیں مل سکی البتہ دستور الفصاحت میں میر تقی میر کے سلسلے حالات میں ایک ملا محمد کا ذکر ملتا ہے جو ولایت سے وارد تھا لکھنؤ میں نواب آصف الدولہ بہادر کی خدمت حاضر ہوا کوئی قصیدہ پڑھنا چاہتا تھا لیکن میر کی موجودگی کے سبب اسے اس کا موقع نہیں مل سکا (دستور ص ۱۰۹) ممکن ہے کہ زیر نظر مخطوطہ اسی کی فرمائش سے تیار کیا گیا ہو واللہ اعلم

آندھرا میں اردو کو دوسری سرکاری زبان قرار دینے کا مطالبہ

انجمن ترقی اردو ضلع محبوب نگر کی جانب سے ۲۰ر مارچ کو رادھا کرشنا ٹاکیز میں شہریان محبوب نگر کا ایک عظیم جلسہ عام منعقد ہوا۔ جلسہ کی صدارت شری کے سدی لنگپا پریزیڈنٹ انجمن ترقی اردو نے کی۔ سری نیواس لاہوٹی آنرس سکریٹری صوبائی انجمن اور خیرات ندیم مہمانان خصوصی کی حیثیت سے جلسہ میں موجود تھے۔

ستورر نگیا چیرمین سٹی میونسپلٹی محبوب نگر نے افتتاحی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ حکومت آندھرا پردیش نے اردو زبان کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے نہ صرف نظم و نسق کی سطح پر بلکہ عدالتوں اور مدارس میں اس کو پھلنے پھولنے اور ترقی کرنے کے مواقع دئے ہیں۔ چونکہ ماہ جون یا جولائی کے اسمبلی سشن میں تلنگی زبان کو سرکاری زبان کی حیثیت سے قانونی موقف دینے کے لیے ایک بل پیش کیا جانے والا ہے۔ اس سلسلہ میں چیف منسٹر نے جو بیانات دیئے ہیں وہ ہر چند ہمارے لیے خوش کن ہیں لیکن ان بیانات میں اردو کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ اس لیے یہ شبہات پیدا ہو رہے ہیں کہ اردو کا قانونی موقف کیا ہوگا کیا صرف تیقنات ہی اردو کو دوسری زبان کا موقف دے سکتے ہیں؟ اس لیے ضروری ہے کہ قانوناً بھی اس کو تسلیم کیا جائے ورنہ اردو بولنے والوں کے حقوق متاثر ہوں گے میں جناب صدر سے گزارش کروں گا کہ صرف قرارداد منظور کروا کر ہی بے فکر نہ ہو جائیں بلکہ ہمارے تاثرات حکومت تک پہنچانے میں موثر نمائندگی کریں۔

مسٹر پی رادھا کشن بی کام سابق کونسلر نے کہا کہ جن کے سروں پر تعصب کا بھوت سوار ہے وہ یہ کہتے ہیں کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے۔ اردو بھارت کی ایک قومی زبان ہے۔ اس کا کسی قطعہ اور منطقہ سے واسطہ نہیں یہ ہر صوبے اور ریاست میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس زبان کو یہ فخر حاصل ہے کہ وہ بھارت کے مختلف صوبوں میں رابطہ کا کام انجام دیتی ہے۔ میں حکومت سے پرزور مطالبہ کروں گا کہ اردو کو آندھرا پردیش میں دوسری سرکاری زبان کا قانونی موقف عطا کرے ورنہ اردو بولنے والے چین سے نہیں بیٹھیں گے!

کے بال ریڈی ایڈوکیٹ نے کہا، مجھے افسوس ہے کہ اردو کو دوسری سرکاری زبان قرار دینے کے لیے جدوجہد کرنے کی نوبت آئی۔ تلگو زبان کی اہمیت سے کس کو انکار ہے۔ تلگو ریاست میں تلگو ہی سرکاری زبان بن سکتی ہے۔ لیکن اردو کی اہمیت سے انکار کرنا بڑی بدبختی ہوگی اس زبان کو دوسری سرکاری زبان قانوناً بنانا ضروری ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ ایک ایسی زبان کو دوسری سرکاری زبان بنانے سے گریز کرنا جو صوبے کے ہی نہیں بلکہ بھارت کے کونے کونے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ بڑی ناانصافی ہوگی اور ہم حکومت آندھرا پردیش کو ایسی ناانصافی کرنے نہیں دیں گے۔ حکومت اردو کے ساتھ لاپروائی نہیں کر سکتی۔ حقایق پر پردہ نہیں ڈال سکتی صرف تیقنات سے کام نہیں چل سکتا اردو کو دوسری سرکاری زبان قرار دینا ہی پڑے گا۔

سری نیواس لاہوٹی نے ایک مبسوط تقریر کرتے ہوئے کہا کہ زبان کے مسئلہ کو سیاست سے علحدہ نہیں رکھا جا سکتا اردو زبان کی ارتقاء اور اس کی تاریخ سیاسی مسایل سے ملی ہے تحریک آزادی میں اس زبان نے جو فرض انجام دیا ہے۔ وہ امتیاز کسی اور زبان کو حاصل نہیں رہا ہے۔ اردو ہمارے رگ و ریشہ میں رچی ہوئی ہے۔ یہ مسلمانوں کی زبان نہیں ہے۔ یہ بھارت کی زبان ہے۔ اردو کو دوسری علاقائی سرکاری زبان کا موقف دینے تک ہم پرامن جدوجہد کرتے رہیں گے۔

جلسہ کو سرزد و بنگلہ امن ایڈوکیٹ۔ عبدالرزاق خان صاحب سولت ایڈوکیٹ۔ مسعود فاروقی ایڈوکیٹ نے بھی مخاطب کرتے ہوئے حکومت آندھرا پردیش پر زور دیا کہ اردو کو قانوناً دوسری علاقائی زبان بنائے۔ شری کے سدی لنگپا پریسیڈنٹ انجمن ترقی اردو ضلع محبوب نگر نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ فی الوقت کوئی احتجاج نہیں کر رہے ہیں صرف سنجیوا ریڈی کے تیقنات کو قانونی شکل دینے کا مطالبہ کرتے ہیں اردو زبان کے تعلق سے جو کچھ کہا گیا ہے۔ اس کے حقایق سے انکار نہیں ہے۔ حکومت کو عوامی تاثرات اور جذبات کا احترام کرنا چاہیئے۔ اردو کو آندھرا پردیش کی دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے قانوناً تسلیم کرنا چاہیئے۔ کرسی صدارت سے قرارداد پیش ہوئی جس کو حاضرین جلسہ نے تالیوں کی گونج میں منظور کیا کچھ شعراء نے اردو پر نظمیں سنائیں۔ عبدالعزیز صاحب عزیز نے بیانات پڑھ کر سنائے۔ نصرت فاروقی سکریٹری انجمن ترقی اردو محبوب نگر نے شکریہ ادا کیا۔ قومی ترانہ کے بعد جلسہ ختم ہوا جلسے میں تقریباً دو ہزار سے زائد عوام شریک تھے۔

(معتمد انجمن ترقی اردو شاخ محبوب نگر (آندھرا))

شہریار

تبصرہ

سفینہ چاہیے

انتخاب کلام شاد عارفی

مرتب:- سلطان اشرف

ناشر:- رامپور پبلشنگ سوسائٹی بنگلہ آزاد خاں رامپور

قیمت:- تین روپے

یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ شاد عارفی جن کی شاعری کا موضوع عام آدمی کی زندگی ہی تھا عوام میں زیادہ مقبول نہیں رہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ شاد صاحب عام زندگی کے ان پہلوؤں کو طنز کا نشانہ بناتے تھے جن کو یا تو وہ عزیز رکھتا ہے یا جن کو وہ نمایاں نہیں کرنا چاہتا۔ کیونکہ ان کے نمایاں ہونے سے اس کے بہت طلسم ٹوٹنے لگتے ہیں۔ یہ پہلو وہ ہیں جو اعلیٰ اقدار کا لبادہ اوڑھ کر زندگی کی جڑوں کو گھن کی طرح کھائے جا رہے ہیں۔

شاد صاحب بقول خود ان کے "آئے نہیں لائے گئے" تھے۔ ان کی پوری زندگی الجھنوں اور پریشانیوں میں گذری اور آسودگی اور سکون نصیب نہ ہو سکا جس کی وجہ سے ان کی شخصیت میں ایک تیز جوشی پیدا ہو گئی جو وقت کے ساتھ کم ہونے کی بجائے بڑھتی ہی گئی اور ایک زمانہ ایسا آیا کہ ان کی شاعری اور شخصیت میں بے پناہ تلخی اور زہرناکی آگئی۔ لیکن طنز کی گہرائی اور مزاج کی نرمی اور زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت نے اس تلخی اور زہر کی کو بھی آرٹ بنا دیا۔

شاد صاحب کی زندگی میں ان کا ایک مجموعہ "سماج" رامپور سے اور ایک، انتخاب انجمن ترقی اردو علی گڑھ سے شائع ہوا تھا۔ ایک زمانے سے یہ خبر گرم ہے کہ "نیا ادارہ" لاہور ان کا کلیات شائع کر رہا ہے دیکھیں کیا گذرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک۔ "سفینہ چاہیے"...... ان کے نمائندہ کلام کا انتخاب ہے جس کو سلطان اشرف نے مرتب کیا ہے اور رامپور پبلشنگ سوسائٹی نے شائع کیا ہے۔ اس انتخاب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شاد صاحب کی زندگی کے آخری ایام کا کلام بھی شامل ہے۔ اس کی ضخامت چھوٹی سے ۱۵۲ صفحات ہے اس لیے ان کی بہت سی نمائندہ نظمیں اور غزلیں شامل ہونے سے رہ گئی ہیں۔ گویا مثل، عابد، شاہد اور

سلطان اشرف نے ان اپنی مضامین میں شاد صاحب کی شاعری اور شخصیت کے بعض اہم پہلو بڑی خوبی اور سلیقے سے اجاگر کیے ہیں۔ احتشام صاحب، مجروح سلطان پوری اور ڈاکٹر محمد حسن نے اپنی مختصر آراء میں شاد عارفی کی اہمیت کی طرف بلیغ اشارے کیے ہیں۔

بحیثیت مجموعی یہ شاد صاحب کے کلام کا خوب صورت انتخاب ہے۔

آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ اسٹیشن سے اردو پروگرام ختم کرنے پر احتجاج

لکھنؤ ۲۰ مارچ۔ لکھنؤ انجمن ترقی اردو کی میٹنگ میں آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ کے خلاف ایک تجویز پاس اور منظور کی ہے کہ لکھنؤ اسٹیشن نے اپنے یہاں سے اردو کے پروگراموں کو تقریباً ختم کر دیا ہے اس سلسلہ میں انجمن ترقی اردو کے سکریٹری نے ڈائرکٹر جنرل آل انڈیا ریڈیو کو تجویز کی نقل بھیجی ہے اور ایک احتجاجی مراسلہ بھی روانہ کیا ہے جس میں لکھا ہے کہ لکھنؤ اردو کا گھر ہے اور یہیں لکھنؤ اسٹیشن نے اردو کے پروگرام کو ختم کر کے اردو کے ساتھ اپنا سنگدلانہ سلوک روا رکھا ہے۔

(الجمعیۃ)

مالک انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ، ایڈیٹر ظہیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوایا اور نذیر حسن پبلشر نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا